حالی کا نظریۂ شعر- بحوالہ مقدمہ شعر و شاعری

ڈاکٹر لیاقت علی/عذرا پروین

ABSTRACT:

Altaf Hussain Hali is one of the renowned prodigies of Urdu literature. He is not only a celebrated autobiographer but also the illustrious critic of Urdu literature. This article engages with "Muqadama sher-o-shairi" to establish a dialogue with the contents of his critical theories and to comprehend his philosophy of poetry.

انتقادِ حالی کا بنیادی اور معتبر حوالہ بلاشبہ **مقدمہ شعرو شاعری** ہی ہے کہ جس کو لے کر کے حالی کی مبالغہ آمیز مدح سرائی بھی کی گئی تو دوسری طرف اسی مقدمے نے انہیں رسوا بھی کیا۔ یہاں تک کہ مقدمہ شعروشاعری کے اہم مدون ڈاکٹر وحید قریشی تک کو کہنا پڑا کہ

> جن فاضلوں نے حالی کے کارنامے کو دنیا کے ادب میں جگہ دی ہے اور مغربی تنقید سے اسے برتر و افضل گردانا ہے ان کا حب الوطنی کا جذبہ قابلِ ستائش ہے لیکن شاید اس سے بڑا ظلم اُردو تنقید پر اور کوئی نہ ہو سکے کہ ہم **مقدمہ شعر و شاعری** کو اس کی اصل قدر و قیمت کا جائزہ لئے بغیر الہامی کتابوں کا درجہ دے دیں۔ (۱)

ہماری تنقیدی روایت میں یہ معاملہ دراصل تذکرے کی روایت سے در آیا کہ معروضیت کی بجائے ذاتی پسند و ناپسند کے پیش نظر کسی ناقد یا تخلیق کار کا انتخاب عمل میں آیا اور پھر شخصی تناظر میں اس کے فن کا مقام اور مرتبہ بھی طے کیا جانے لگا۔ یہی کچھ حالی کے ساتھ بھی ہوا کہ ان کے تنقیدی افکار جہاں بہت سوں کو بھلے لگے وہیں ''ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے'' ایسی پھبتیاں بھی کسی گئیں۔ مقدمہ شعروشاعری یقیناً نہ کوئی الہامی کتاب ہے نہ تنقید کا ارفع ترین نمونہ۔ لیکن اس بات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک پوری صدی گزرنے کے بعد بھی حالی کے اس مقدمے پر مکالمہ جاری ہے اور اب بھی بنیادی تنقیدی تصورات کی تشکیل میں کہیں نہ کہیں مقدمے کی

معاونت ناقدین کے شاملِ حال ہے۔ یہ مقدمہ اگرچہ حالی کے طبع زاد تصورات کی بجائے مغربی ناقدین کی ایک پوری فہرست (لان جائی نس سے ایلیٹ تک) سے استفادہ کر رہا ہے لیکن جو شے حالی کو اہمیت بخش رہی ہے وہ ان کا وہ اسلوبِ بیان اور مشرقی شعری روایت کا شعور ہے جس پر وہ ان نظریات کو اس خوبی سے منطبق کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ نظریات مغربی تنقیدی روایت کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں۔ اس کے برعکس آج کی نئی تنقید مغرب سے نظری سطح پر تو استفادہ کر رہی ہے لیکن حالی ایسا کوئی ناقد اسے فی الوقت دستیاب نہیں آیا جو اسے اپنی تخلیقی روایت پر منطبق کر کے سیر حاصل نتائج حاصل کر سکے۔ ویسے حالی کی مغربی تنقید سے استفادے کی صورت بھی اپنی جگہ متنازعہ رہی۔ ایک طرف تو انہیں اسی پر آڑے ہاتھوں لیا گیا تو دوسری طرف ان کی ناپختہ تفہیم پر کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی ایسے ناقدین کی توقعات اپنی جگہ ایک سوال بن جاتی ہیں جس پر عہد حاضر کے نقاد اور مقدمہ کے اب تک کے آخری مدون ڈاکٹر قاضی عابد کا یہ تبصرہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ

> کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی جو توقعات حالی سے وابستہ کر کے ان کی تنقید کو رد کرتے ہیں آج انہیں بنیادوں پر ان دونوں حضرات کی تنقید کا رد بھی ممکن ہے۔ حالی اول الناقدین تھے، خاتم الناقدین نہیں ...... اگر حالی انیسویں صدی کے نصف آخر کے مغربی ناقدین سے واقف نہ تھے تو کیا خود کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی جیسے وسیع المطالعہ نقاد بیسویں صدی کے نصف اول مغربی مفکرین/ناقدین سا شیور، لیوی سٹراس، رولاں بارتھ، نارتھ روپ فرائی وغیرہ سے واقفیت کا مظاہرہ اپنی تنقید میں کر سکے ہیں۔ (۲)

اسی طرح ڈاکٹر نجیب جمال حالی کے مخصوص نظریات کے پیچھے جہاں مغربی فکر کو پنہاں دیکھتے ہیں وہیں ان کے خیال میں

> یہ اثرات حالی کے ذہن پر اس لیے بھی مرتب ہوئے کہ انہیں شاعری کی انحطاطی اور اجتماعی معاشرتی شعور سے عاری روایت ورثے میں ملی تھی۔ شاعری میں شوق کی سچی حرارت نابود، جذبے کی توانائی اور طرزِ احساس کی دلکشی مفقود اور تخیل کی ندرت نہ ہونے کے برابر تھی۔ محض جذبے کی نقالی، شاعرانہ تعلّی اور کیفیات کی سطحی صورت باقی رہ گئی تھی۔ اور شاعری میں موضوع سے زیادہ ہیئت کو اہمیت دی جانے لگی تھی۔ (۳)

اب آیئے براہ راست اس مقدمے کے مندرجات کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں کہ جو حالی کے تصورِ شعر کی تشکیل کر رہے ہیں یا دوسری طرف آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے تصورِ شعر کی عملی تفسیر کا کام دے رہے ہیں۔ یہ مقدمہ ''حالی کے دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں ان کی زندگی میں پہلی اور آخری بار شائع ہوا۔'' (۴)

آغاز ہی میں الطاف حسین حالی ایک متوازن نقاد کے طور پر متعارف ہوتے ہیں۔ جو کارجہاں میں شریک مختلف اہلیت کے حامل افراد کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور کسی کو بے کار تصور نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک صلاحیتوں کا یہی تنوع ارتقاء کائنات کے لیے ناگزیر ہے۔ اگرچہ وہ بھی یہاں افلاطون کی طرح اہل حرفہ اور فن کاروں میں یہ

امتیاز بھی کر دیتے ہیں کہ کسان یا معمار عملی طور پر سود مند ہے جبکہ ویرانے میں بانسری کی دھن بجانے والا جو کئی دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اس سے اگر چہ بنی نوع انسان کے کسی (مادی) فائدے کی توقع نہیں مگر وہ بھی خود کو اتنا ہی ضروری خیال کرتا ہے۔ آگے چل کر حالی شاعری کے معاشرتی ردو قبول کو لے کر کے اس رائے کے حق میں نظر آتے ہیں کہ شاعری کی شاید اتنی مدح نہیں کی گئی جس قدر کہ مذمت کی گئی ہے۔

> خود ایک شاعر کا قول کہ دنیا میں شاعر کے سوا کوئی ذلیل سے ذلیل پیشہ والا ایسا نہیں ہے جس کی سوسائٹی کو ضرورت نہ ہوا۔ (۵)

لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اسے میجک لینٹرن سے مشابہہ بھی قرار دے دیتے ہیں۔ جو تاریکی میں زیادہ روشن نظر آتی ہے۔ یوں ان کے بقول

> شعر جس قدر جہل و تاریکی کے زمانے میں ظہور کرتا ہے اسی قدر زیادہ رونق پاتا ہے۔ (۶)

یہ واضح رہے کہ حالی شاعری کی بابت میجک لنٹرن کی اس شبیہ کو شعر کی مذمت میں دی جانے والی ایک دلیل سمجھتے ہیں تبھی تو اگلی ہی سطر میں کہتے ہیں:

> یہ اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں جو شعر کے برخلاف کہی گئی ہیں ایسی ہیں جو لامحالہ تسلیم کرنا پڑتی ہیں۔ (۷)

جب کہ غور کیا جائے تو یہ شاعری کی مذمت نہیں اس کا اعتراف ہے کہ تاریکیوں میں جو اپنا جوہر زیادہ کھل کر آشکار کرتی ہے۔ یوں بھی اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بالعموم سیاسی و سماجی زوال کے عہد ادبی عروج کے عہد قرار پاتے ہیں۔ جس کی بڑی مثال اردو شاعری کا عہد زریں قرار پانے والا میر و سودا کا عہد بھی ہے اور ۱۸۵۷ء اور ۴۷ء کا آشوب بھی کہ جس نے ادب کو ایک وسیع ذخیرے سے نوازا۔ حالی کے خیال میں شاعری بھی دراصل ایک صلاحیت ہے بالکل اسی طرح جیسے شجاعت یا عقل مندی صلاحیتیں ہیں۔ اصل معاملہ صلاحیت کے استعمال کا ہے نہ کہ صلاحیت کے وجود کا۔ اگر استعمال مثبت ہو تو شاعری بھی معاشرے کے اندر بڑی تبدیلیاں لا سکتی ہے اور اس سے بھی بہت سے سماجی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

اب اگلا مرحلہ انہیں یہ درپیش ہے کہ کیا یہ صلاحیت فطری شے ہے یا اکتسابی۔ تو حالی کا پلڑا فطری یا خداداد صلاحیت کے حق میں ہے۔

> شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ بعض طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ (۸)

آگے وہ شاعری سے لئے جانے والے مختلف کاموں کی نشاندہی کرتے ہوئے زمانہ قدیم میں ایتھنز اور مگارا والوں کے بیچ جزیرہ سلیمس کی بابت جاری لڑائی کا حوالہ دیتے ہیں کہ کیسے ہزیمت اور شکست سے دوچار ایتھنز والوں نے یوں پسپائی اختیار کی کہ ہمیشہ کے لیے لڑائی سے بھی دستبردار ہو گئے۔ ایسے میں سولن کے اشعار نے ان میں حمیت کے احساس کو بیدار کیا اور انہوں نے اسی کو سپاہ کا سردار مقرر کر کے سلیمس پر چڑھائی کی اور فتح یاب ہوئے۔

اے عزیزو! جلد دشمنوں سے انتقام لو اور یہ ننگ و عار ہم سے دور کرو۔ اور چین سے نہ بیٹھو۔
جب تک کہ اپنا چھینا ہوا ملک ظالم دشمنوں کے پنجے سے نہ چھڑا لو۔ (۹)

حالی کی یہ مثال جہاں ایک مثبت نظر سے دیکھی جا سکتی ہے وہیں افلاطون کے اس اعتراض کی عملی توثیق بھی کرتی نظر آتی ہے جس میں اس نے شاعروں کی ایک بڑی خرابی ہمیں یہ بتائی تھی کہ وہ جذبات کو برانگیختہ کر دیتے ہیں اور انہیں اپنے حواس پر قابو نہیں ہوتا۔ (۱۰)

حالی بھی یہاں ایسی جذباتیت کو شاعری کا اعجاز بنا کر پیش کرتے ہیں جس پر کلیم الدین احمد نے بھی اعتراض کیا ہے۔ شعر کی تاثیر کے حوالے سے حالی نے جو مثالیں دی ہیں ان کے نزدیک وہ ساری مثالیں وہ ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ حالی کے نزدیک شعر کی تاثیر اس کے تاثر کی بجائے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں ہے۔

جس تاثیر کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اہم نہیں۔ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں ہے۔ شاعری جذبات کی تہذیب و تربیت کرتی ہے انہیں برانگیختہ نہیں کرتی۔ (۱۱)

حالی ایسی کئی مثالیں دیتے ہیں جہاں شاعری کا مقصد جذبات کو برانگیختہ کرنا ہی قرار پاتا ہے۔

لارڈ بائرن کی نظم موسوم بہ چائلڈ ہیرلڈز پلگر یج ایک مشہور نظم ہے جس کے ایک حصے میں فرانس، انگلستان اور روس کو غیرت دلائی ہے اور یونان کو ترکوں کی اطاعت سے آزاد کرانے پر برانگیختہ کیا ہے۔ (۱۲)

اس وقت فرانس میں بھی دو قصیدے ایک منسوب بہ پیرس اور دوسرا منسوب بہ مارسلیز لکھے گئے تھے جو گزرگاہوں اور شاہراہوں میں طبلِ جنگ پر گائے جاتے تھے اور جن میں لوگوں کو بادشاہ سے بغاوت اور آزادی کی حمایت پر اکسایا گیا تھا۔ (۱۳)

تاہم اعشیٰ کے کلام کی تاثیر کی بابت حالی کا اشارہ واقعی شاعری کو ایک سماجی المیے کے حل کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وگرنہ یوں محسوس ہوتا ہے حالی کا رویہ بہت فاشسٹ ہے۔ جو شاعری کو خون خرابے کے لئے ہی استعمال ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار کی تاثیر بھی ان کے ہاں ایسا ہی رنگ دکھاتی نظر آتی ہے۔

اس کے سوا زمانہ جاہلیت میں ایسی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ مثلاً شاعر اپنے قبیلہ کو جب کہ تمام قبیلہ کے لوگ اپنے مقتولین کا خوں بہا لینے پر راضی ہیں ملامت کرتا ہے اور قاتل سے انتقام لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ یا کسی رنجش کی وجہ سے اپنے قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے لڑنے یا بدلہ لینے کے لیے برانگیختہ کرتا ہے۔ (۱۴)

حالی شاعری کے پر تاثیر ہونے پر دو طرح کی آراء کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک وہ جو شاعری کے لئے تہذیبی ترقی یا سائنسی ترقی کو شاعری کی بنیاد یعنی تخلیق کے لیے سم قاتل سمجھتے ہیں۔

جس قدر کے علم زیادہ محقق ہوتا جاتا ہے اسی قدر تخیل جس پر شاعری کی بنیاد ہے گھٹتا جاتا ہے

اور کرید کی عادت جو ترقی علم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ شعر کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ (۱۵)

یعنی جو شاعری کو حیرتوں کا امین جانتے ہیں اور جوں جوں سائنسی شعور حیرتوں کے طلسم کو توڑتا جاتا ہے شاعری اپنا اثر کھونے لگتی ہے۔ تو گویا شاعری لاعلم، یا کم علم یا غیر سائنسی معاشرے کا تقاضہ کرتی ہے۔ جب کہ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو سائنسی ترقی یا تہذیبی ترقی کو متخیلہ کے لیے نت نئے امکانات کا ذریعہ گردانتے ہیں۔

> یہ سچ ہے کہ سائنس اور مکینکس جو شلیے خیالات کو مردہ کرنے والے ہیں لیکن انہی کی بدولت شاعر کے لیے نئی نئی تشبیہات اور تمثیلات کا لازوال ذخیرہ جو پہلے موجود نہ تھا مہیا ہو گیا ہے۔ (۱۶)

حالی یہ دونوں نقطہ ہائے نظر سامنے رکھ دیتے ہیں لیکن ایک عمدہ نقاد کی مانند اس پر اپنا نقطہ نظر واضح نہیں کرتے۔ شاعری کو اخلاقیات سے جوڑتے ہوئے حالی کہیں مذہبی یا سماجی مبلغ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جب کہ فنون لطیفہ کا بنیادی وظیفہ کہیں معدوم ہونے لگتا ہے۔ ذرا دیکھئے

> پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔ قومی افتخار، قومی عزت، عہد و پیمان کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے، استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا، ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں۔ (۱۷)

حالی کے اس نقطہ نظر پر کلیم الدین احمد نے بھی گرفت کی ہے۔ (۱۸)

تاہم حالی افلاطون کی انتہا پسندانہ سوچ سے اتفاق نہیں کرتے کہ جو اپنی مثالی ریاست میں شاعروں کو جگہ دینے پر آمادہ نہیں۔

> اگر افلاطون اپنے خیالی کانسٹیٹیوشن سے شاعروں کو جلا وطن کر دینے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ہرگز اخلاق پر احسان نہ کرتا۔ بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک سرد مہر، خودغرض اور مروت سے دور ایسی سوسائٹی قائم ہو جاتی جس کا کوئی کام اور کوئی کوشش بدونِ موقع اور مصلحت کے محض دل کے ولولہ اور جوش سے نہ ہوتی۔ (۱۹)

فنونِ لطیفہ کی بات حالی کا یہ رویہ بہرحال خوش آئند ہے اور متوازن بھی۔

حالی شاعری کو سوسائٹی کے تابع بھی خیال کرتے ہیں۔ سوسائٹی کا مزاج شاعر پر اثر انداز ہوتا ہے۔

> جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ (۲۰)

ان کے نزدیک فن شعر گوئی کی طرف رغبت مسلمان شعراء کے ہاں بالعموم اس وجہ سے ہوئی کہ یا تو انہیں بادشاہوں سے انعام و اکرام سے نوازا گیا یا واہ واہ یعنی تعریف کی خواہش نے انہیں بگڑی ہوئی سوسائٹی کا نمائندہ بنانا شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں حالی سوسائٹی کے اثرات سے بگڑے ہوئے ذہن کو واپس سوسائٹی پر برے اثرات کا

موجب گردانتے ہیں کہ شاعر جب بگڑتا ہے تو زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

> اگر چہ شاعری کو ابتداً سوسائٹی کا مذاقِ فاسد بگاڑتا ہے مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ جب جھوٹی شاعری کا رواج تمام قوم میں ہو جاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغہ سے سب کے کان مانوس ہو جاتے ہیں۔ (۲۱)

حالی کے نزدیک بگڑا ہوا شاعر اپنے مبالغہ انگیز بیانات پر مبنی داد کے سبب اسی کو اختیار کرتا ہے سو ''وہ مبالغہ میں غلوا سے کام لیتا ہے تا کہ اور زیادہ داد ملے۔''(۲۲) اور یوں جھوٹے فسانے اور من گھڑت باتوں کا مبالغہ آمیز بیان سوسائٹی کا عمومی چلن بن جاتا ہے۔ چونکہ کسی سوسائٹی کی تقریر و تحریر اور روزمرہ کی زبان اپنے لیے شعراء کی زبان کو مثالی سمجھتی ہے، اس لئے اب یہ زبان عوام الناس میں بھی جڑیں پکڑ کر سوسائٹی کے مزاج کو خراب کرتی ہے۔

حالی کا شاعری کو سماجی اصلاح کا اہم وسیلہ بنانا انہیں یہاں تک لے آتا ہے کہ وہ اس کے لیے وزن کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر چہ وزن کی بابت ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر یہی وزن خیال کے راستے میں آن کھڑا ہو تو حالی بہرحال خیال کو مقدم جانتے اور وزن کو قربان کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں انگریزی شاعری کی دو اصطلاحوں یعنی پوئٹری اور ورس کی مانند وہ شعر اور نظم میں یہ امتیاز روا رکھتے ہیں کہ شعر میں لازم نہیں ہاں نظم میں وزن کا خیال رکھنا چاہیے۔ حالی نے یہاں ابہام پیدا کیا ہے۔ اگر چہ وہ انگریزی میں ورس کے لیے وزن کو ضروری اور پوئٹری کے لیے ضروری نہیں، کو پیش نظر رکھ کر اسے اُردو میں شعر اور نظم پر منطبق کرتے ہیں لیکن اس سے قاری کی پوری طرح تشفی نہیں ہوتی کہ وہ شعر و نظم کو الگ الگ خانوں میں کیوں کر رکھے۔ حالی کے مقدمے کے خصوصی ماخذات اگر چہ انگریزی ادب کی روایت سے منسلک ہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے بہت سی باتیں انہوں نے حوالے کے بغیر کہیں حافظے میں محفوظ رکھی ہوئیں ہیں جنہیں کئی مواقع پر استعمال تو کرتے ہیں لیکن حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ مثلاً وزن کی بابت ان کی یہ رائے ایک مثال ہے اور اس جیسی کئی مثالیں مقدمے میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، جہاں وہ یہ تو قبول کرتے ہیں کہ یہ بات انہوں نے انگریزی ادب سے اخذ کی ہے لیکن کس سے؟ یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتے۔

> یورپ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ اگر چہ وزن پر شعر کا انحصار نہیں ہے اور ابتدا میں وہ مدتوں اس زیور سے معطل رہا مگر وزن سے بلاشبہ اس کا اثر زیادہ تیز اور اس کا منتر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے۔ (۲۳)

شعر کی ماہیت کے ضمن میں بھی حالی پوری طرح اپنا نقطہ نظر واضح کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ایک طرف تو وہ لارڈ میکالی کی شعر کی تعریف کو کسی قدر مکمل مانتے ہیں تو دوسری طرف وہ اگلے ہی پیراگراف میں اس تعریف پر خط تنسیخ کھینچ کر شاعری کو دیگر فنون پر فوقیت پر بھی دے دیتے ہیں۔ مثلاً میکالی کی یہ رائے وہ پیش کرتے ہیں اور واضح طور پر اس کے حق میں بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔

> البتہ لارڈ میکالی نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے وہ اس کو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن جو

کچھ شعر سے آج کل مراد لی جاتی ہے اس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری جیسا کہ دوہزار برس پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہہ ہے مگر مصور، بت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ (۲۴)

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں:

لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ (۲۵)

تو گویا ایک کنفیوژن سی ہے کہ آخر حالی کے نزدیک شاعری ہے کیا؟ اپنے تصورِ شعر کو کسی قدر واضح کرتے ہوئے آگے چل کر پھر کسی نامعلوم محقق کا خیال مستعار لیتے ہوئے کہتے ہیں:

ایک اور محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعے سے اس لیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو اور خواہ نثر میں۔ (۲۶)

گویا حالی کے نزدیک بنیادی شے خیال کی شعریت ہی کسی متن کو شاعری میں ڈھالتی ہے خواہ وہ نثر کے پیرائے میں ہو یا منظوم۔ آج نثری نظم کے مباحث بھی عروج پر ہیں اور حالی کی یہ رائے آج کی نثری نظم کے حق میں بھی ایک اہم دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ کیا ہر وہ خیال جو غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعے یوں ادا ہو کہ سامع کا دل اسے سن کر خوش یا متاثر ہو تو وہ شاعری کہلوائے گا؟ اس پر شاید بہت سے تحفظات سامنے آ جائیں۔ اول اول تو یہی کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سا خیال عین اس انداز میں قاری کو متاثر کرتا ہے کہ وہ اسے شاعری کہے یا دوسری بات کہ کیا دنیا کا ہر وہ متن جو پر اثر ہے شاعری کہلوائے گا؟ اس سے جڑی ایک اور بات یہ بھی کہ اگر پرتاثیر بات کرنا ہے تو لامحالہ وہ شاعری ہی میں ممکن ہے کسی اور پیرائے میں ممکن ہی نہیں؟ بلکہ اگر اثر ہو گیا تو سمجھیں وہ شاعری ہے؟

یہ نقطہ نظر شاعری کو ایک بہترین اور لازوال پیرائیہ اظہار کے طور پر متعارف کروا رہا ہے جو اپنی جگہ بحث طلب ہے۔ آگے چل کر حالی شاعری کے لئے تین اہم اوصاف کا ذکر کرتے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ ان میں پہلا وصف تخیل ہے جو بقول حالی

یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و استقبال کو اس کے لیے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ (۲۷)

اب تخیل کی تعریف میں وہ یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دراصل یہ ایسی صلاحیت ہے جو شاعر کے ادراک میں پہلے سے موجود اشیاء کو ایسی نئی ترتیب میں ڈھال دیتی ہے کہ معمولی شے بھی غیر معمولی بن جاتی ہے۔

یہاں یہ سوال بہرحال کیا جا سکتا ہے کہ تخیل کی اثر آفرینی کیا محض شاعر کے لئے ضروری ہے؟ یا تخلیق کی دنیا ہے ہی اسی کا نام جہاں چیزیں ایجاد نہیں دریافت کی جاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ کسی خیال یا موضوع کا وجود ہی سرے سے نہ ہو۔ اصل میں اس کی حسنِ ترتیب ہے جو ایک تخلیق کار کو عام قاری سے الگ کرتی ہے۔ دوسری شرط وہ کائنات کا مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں مطالعہ سے مراد انسانی تجربات، مشاہدات اور مطالعات میں وسعت ہے کہ جو جس قدر زیادہ ہوگی اتنا ہی شاعر اپنے خیالات کو نکھار سکے گا۔ تیسری شرط وہ تفحصِ الفاظ کو مانتے ہیں۔ یہاں یہ بحث ایک الگ مضمون کا تقاضا کرے گی کہ یہ تینوں شرطیں اس سے قبل پہلی صدی عیسوی کے مغربی نقاد لان جائی نس کے ہاں بیان ہو چکی ہیں۔ بہرحال حالی نے یہ کام ضرور کیا کہ مغربی شعری تصورات کو مشرقی شعریات اور اپنی شعری اور تہذیبی روایت میں گوندھ دیا۔ جس سے ان کے نظریات میں ترجمے کی بجائے طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ یوں بھی علم کی دنیا میں استفادے کی صورت ہی ہے جو اسے آگے بڑھا رہی ہے وگرنہ یہ بھی جامد ہو جاتا۔ حالی بھی انتخابِ الفاظ کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کا بھی یہ خیال ہے کہ اوسط درجے کے شاعر اور اچھے شاعر میں یہی فرق ہے کہ اچھا شاعر اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے منتخب کئے گئے لفظوں کے اثر سے بھی بخوبی واقف ہوتا ہے۔

اس بابت ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاعر کے تخیل کو محض خیالات کی ترتیب تک محدود نہیں کیا جا سکتا، اسے الفاظ کی ترتیب میں بھی اسی قدر دخل ہے۔ وہ شاعر جنھیں الفاظ کے استعمال کا حقیقی شعور حاصل ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کس خیال کی ترسیل کے لئے کون سے الفاظ اور ان کی کیسی ترتیب مطلوب ہے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ بسا اوقات وزن اور قافیے کی پابندی الفاظ کے مناسب چناؤ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ لیکن وہ ایک خلاق شاعر کو اس مشکل میں گرفتار ہونے کی بجائے راستہ نکالنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

> اگرچہ وزن اور قافیہ کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اس لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ (۴۸)

شاعری میں آمد اور آورد کے معاملے کو لے کے حالی اس ضمن میں دی جانے والی اس مثال پر گرفت کرتے ہیں کہ جہاں یہ کہا گیا کہ جو شیرہ انگور سے از خود ٹپکتا ہے اس شیرے سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے کہ جسے زبردستی نچوڑ کر نکالا جائے۔ حالی آمد کے حق میں دی اس دلیل کو ایک اور نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس مثال میں یہ رمز بھی پوشیدہ ہے کہ ازخود ٹپکنے والا شیرہ دراصل پکنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ بعینہٖ خیال بھی شاعر کے ذہن میں ترتیب پانے اور اظہار کے بیچ خاصا وقت لیتا ہے۔ حالی دراصل ریاضت یا جانچ پرکھ کے معاملے میں اسی دورانیے کو سامنے نہیں رکھتے جو شعر گوئی کے بعد قطع برید سے متعلق ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ شعر کی ترتیب کا ہر مرحلہ خود شاعر کے تخیل میں سرانجام پاتا رہتا ہے۔ تاہم وہ آمد کو جہاں فطری صلاحیت مانتے ہیں وہیں آورد کے بھی قائل ہیں۔ ان کا یہ خیال اہم ہے کہ

جس قدر کسی نظم میں زیادہ بے ساختگی اور آمد معلوم ہو اسی قدر جاننا چاہیے کہ اس پر زیادہ محنت، غور اور زیادہ حکم و اصلاح کی گئی ہوگی۔ (۲۹)

آگے چل کر حالی، ابنِ خلدون کے اس نقطہ نظر کو بھی آڑے ہاتھوں لیتے ہیں جہاں وہ بنیادی اہمیت الفاظ کو دیتے ہیں اور معنی کو اس پانی سے مترادف قرار دیتے ہیں جو اپنے پیالے کی ساخت سے معتبر ٹھہرتا ہے۔ حالی کے خیال میں

اسی طرح معنی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے۔ (۳۰)

حالی شعر گوئی کے لیے ابن رشیق کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ تو وسیع ہونا چاہیے لیکن شعر کہتے ہوئے انہیں ذہن سے حذف کر لینا چاہیے تا کہ شاعر تقلیدِ محض سے بچ سکے۔ حالی متخیلہ کے بارے میں بھی کلی آزادی کے قائل نہیں۔ بلکہ اسے قوتِ ممیّزہ کے تابع رکھنے کے خواہاں ہیں۔ آگے چل کے حالی اچھے شعر کے تین بنیادی اوصاف یعنی سادگی، اصلیت اور جوش پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کی بابت حالی خود ہی واضح کر دیتے ہیں کہ وہ انہیں ملٹن سے مستعار لے رہے ہیں۔ سادگی سے وہ لفظ و معنی دونوں کی سادگی مراد لیتے ہیں۔ یعنی شعر کے مضمون کے لیے جن لفظوں کا انتخاب عمل میں آئے وہ ویسے ہی ہونے چاہئیں جیسا کہ اس زبان کے روز مرہ میں مستعمل ہیں۔ اور خیال کی بنیاد بھی اسی پر رکھنی چاہیے جو حدِ امکان میں آ سکے۔ شعر کی دوسری خوبی یعنی اصلیت سے مراد وہ یہی لیتے ہیں کہ شعر میں بیان ہونے والے خیال کی بنیاد ایسے ہی واقعے پر ہونی چاہیے جو درحقیقت کوئی وجود بھی رکھتا ہو۔ یعنی دوسرے لفظوں میں حالی بعید از قیاس خیال کو شعر کے لیے مضر خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح جوش سے حالی روایتی لغوی معنی مراد نہیں لیتے بلکہ اس سے مراد وہ بے ساختگی لیتے ہیں جو کسی بھی شاعر کو از خود شعر گوئی پر مائل کر دے۔ بجائے اس کے کہ وہ سوچ سوچ کر اور کیفیت کو خود پر طاری کر کے شعر گھسیٹے۔ بقول حالی:

جوش سے یہ مراد ہے کہ مضمون ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرائے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کے شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اس سے بندھوایا ہے۔ (۳۱)

یہاں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ بے ساختگی کو شاعری کا اہم وصف ماننے والے حالی انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں میں پہلے سے موضوع کا تعین کر کے نظموں کی تخلیق کی حمایت کیونکر کر سکتے ہیں؟ شاید یہ ایک نوآبادیاتی جبر ہے کہ جس نے حالی کو اپنے نظریہ شعر کے برعکس ایسی شاعری پر سمجھوتہ کرنا سکھایا۔ مقدمہ میں آگے چل کر حالی نیچرل شاعری کے عنوان سے اپنے تصورِ شعر کو مزید واضح کرتے ہیں۔ نیچرل شاعری سے بھی حالی وہی شاعری مراد لیتے ہیں۔ جو بعید از قیاس نہ ہو اور جس میں مبالغہ جھوٹ کی حدوں کو چھونے سے اجتناب کرے۔ اس بابت وہ مثالیں دے کر واضح کرتے ہیں کہ کیسے قدما کے قائم کیے ہوئے معیارات کو بعد میں آنے والوں نے بدل

کر اصلیت سے دور یعنی ان نیچرل کر دیا۔

شعر کی زبان سے متعلق حالی کا نقطہ نظر اپنی جگہ دلچسپی کا حامل ہے۔ ایک طرف تو وہ بے ساختگی کے عنصر کو قائم رکھنے کے لیے اہلِ وطن کو مشورہ دیتے ہیں کہ

> پس اگر ہمارے ہم وطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں شعر کہنا چاہے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ مادری زبان سے بہتر اور سہل تر کوئی آلہ اظہار خیالات کا نہیں ہو سکتا۔ (۳۲)

لیکن ساتھ ہی ساتھ اُردو زبان کی وسعت کو وہ اس قابل سمجھتے ہیں کہ جو ہندوستان میں شعر گوئی کا حقیقی بار اٹھانے کی اہل ہے۔ اس لیے لکھتے ہیں

> اس کے سوا ہندوستان کی تمام زبانوں میں بالفعل کوئی زبان ایسی نہیں معلوم ہوتی جس میں اردو کے برابر شعر کا ذخیرہ موجود ہو اس لیے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں میں جو شخص شعر کہنا اختیار کرے وہ اردو ہی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ قرار دے۔ (۳۳)

زبان کے حوالے سے حالی کا نقطہ نظر وسعتِ قلبی اور روشن خیالی پر بھی مبنی ہے کہ وہ اسے محدود کرنے کی بجائے اس میں قبولیت کے مادے کو ترویج دیتے ہیں۔

> زبان کے متعلق ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے۔ نیچرل شاعری کے لیے جیسا کہ ظاہر ہے ہماری موجودہ زبان کافی نہیں ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس میں وسعت پیدا کی جائے۔ پس اہلِ لکھنو جو زبان کے دائرے کو روز بروز زیادہ تنگ کرتے جاتے ہیں یہ عمل متقاضہ ٔوقت کے بالکل خلاف ہے۔ (۳۴)

یوں حالی بیک وقت ایک روایت پسند نقاد بھی ہیں اور روایت شکن بھی۔ ان کے ہاں رد و قبول کا ایک متوازن رجحان موجود ہے۔ جہاں ہٹ دھرمی یا اندھی عقیدت کی بجائے عصری رجحانات اور تہذیبی شعور کا ایسا امتزاج ترتیب پاتا ہے جو مغربی تفکرات کو بھی مشرقی شعریات کا جزو بنا دیتا ہے۔ شاید یہی حالی کی بڑائی بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

حوالہ جات:

(۱) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء ص ۳۴

(۲) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، قاضی عابد، ڈاکٹر (مرتب)، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۴ء، ص ۹

(۳) نجیب جمال، ڈاکٹر، **نگاہ**، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۱

(۴) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، قاضی عابد، ڈاکٹر (مرتب)، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۴ء، ص ۴

(۵) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰

(۶) ایضاً ص ۱۰

(۷) ایضاً ص ۱۰

(۸) ایضاً ص ۱۱

(۹) ایضاً ص ۱۳

(۱۰) وہاب اشرفی، **قدیم مغربی تنقید**، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۸

(۱۱) کلیم الدین احمد، **اردو تنقید پر ایک نظر**، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۳۷

(۱۲) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

(۱۳) ایضاً ص ۱۴۔۱۵

(۱۴) ایضاً ص ۱۶

(۱۵) ایضاً ص ۱۸

(۱۶) ایضاً ص ۱۹

(۱۷) ایضاً ص ۲۰

(۱۸) کلیم الدین احمد، **اردو تنقید پر ایک نظر**، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۵۷

(۱۹) الطاف حسین حالی، **قدمہ شعر و شاعری**، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱

(۲۰) ایضاً ص ۲۱

(۲۱) ایضاً ص ۲۸

(۲۲) ایضاً ص ۲۸

(۲۳) ایضاً ص ۳۳

(۲۴) ایضاً ص ۳۴

(۲۵) ایضاً ص ۳۴

(۲۶) ایضاً ص ۳۵

(۲۷) ایضاً ص ۳۷۔۳۸

(۲۸) ایضاً ص ۴۳

(۲۹) ایضاً ص ۴۵

(۳۰) الطاف حسین حالی، **مقدمہ شعر و شاعری**، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۴۶

(۳۱) ایضاً ص ۵۷

(۳۲) ایضاً ص ۸۳

(۳۳) ایضاً ص ۸۴

(۳۴) ایضاً ص ۸۷